AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)

Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

Existential Anxiety and Inner Consciousness in the Poetry of N.M. Rashid: An Intellectual and Aesthetic Study

ن م راشد کی شاعری میں وجودی اضطراب اور داخلی شعور: ایک فکری و جمالیاتی مطالعہ

ڈاکٹر اسد محمود خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو / انٹر نیشنل ریلیشنز, منہاج یونیورسٹی، لاہور
assadphdir@gmail.com

Abstract

This study explores the presence and articulation of existential anxiety and inner consciousness in the poetry of Noon Meem Rashid, one of the leading figures of modern Urdu poetry. Through a philosophical and aesthetic lens, the research analyzes how Rashid's poetic imagination confronts themes of fear, isolation, identity, and personal awakening. The study draws on existentialist thought—particularly from Kierkegaard, Heidegger, and Sartre—and connects these ideas to Rashid's poetic vocabulary, metaphors, and free verse structure. Focusing on select poem such as Zindagi se Darrtay Ho, the paper identifies recurring existential motifs including dread of time, silence, the unknown, and a longing for authentic selfhood. Rashid's language does not merely represent inner turbulence but transforms it into a mode of resistance and self-discovery. His stylistic choices—symbolism, abstraction, rhetorical questions—further reflect the poet's journey into the depths of being. This study concludes that Rashid's poetry functions not only as personal expression but also as a philosophical discourse that resonates with the spiritual and intellectual crises of the modern human condition.

Key Words: Existential Anxiety, Inner Consciousness, Modern Urdu Poetry, Symbolism, Free Verse, Selfhood

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

(مُلخَّص)

یہ مطالعہ ن م راشد کی شاعری میں موجود وجودی اضطراب اور داخلی شعور کے اظہار کو فکری اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے تحلیل کرتا ہے۔ ن م راشد، اردو نظم کے جدید رجحانات کے نمائندہ شاعر کے طور پر، فرد کے داخلی خوف، شناخت کے بحران، خاموشی، اور خودی کی بیداری جیسے وجودی موضوعات کو نہایت علامتی اور تجریدی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ مقالہ راشد کی نظم: "زندگی سے ڈرتے ہو" کے ذریعے ان عناصر کا جائزہ لیتا ہے جو وجودی فکر سے ہم آہنگ ہیں، جیسے وقت کا خوف، ناگفتہ حقیقت، تنہائی، اور باطنی اضطراب۔ تحقیق میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ راشد کا اسلوب صرف داخلی کیفیات کی عکاسی نہیں بلکہ ان کی تخلیقی تبدیلی کا مظہر بھی ہے۔ ان کی شاعری نہ صرف فرد کے وجودی بحران کو بیان کرتی ہے بلکہ اس سے آزادی، خودی کی بازیافت اور فکری مزاحمت کا راستہ بھی نکالتی ہے۔ نتیجتاً، ن م راشد کی نظموں کو صرف ادبی فن پارے نہیں بلکہ ایک فکری و روحانی مکالمہ بھی کہا جا سکتا ہے جو آج کے انسان کی داخلی گہرائیوں کو آواز دیتا ہے۔

کلیدی الفاظ : وجودی اضطراب، داخلی شعور، جدید اردو نظم، علامت، آزاد نظم، خودی

ن م راشد کی شاعری میں وجودی اضطراب اور داخلی شعور: ایک فکری و جمالیاتی مطالعہ

(1)

ادب انسانی شعور کا وہ گہرا اور باریک منظر نامہ ہے جہاں لفظ، خیال اور تجربہ ایک تخلیقی وحدت میں ضم ہو کر ایسی جمالیاتی فضا قائم کرتے ہیں جو صرف خارجی حقیقت یا سطحی مناظر پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ فرد کے باطن، احساسات اور لاشعوری محرکات کو بھی اپنی گرفت میں لاتی ہے۔ اگرچہ ادب کی مختلف اصناف نے مختلف انداز میں انسانی تجربے کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن نظم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ انسانی شعور کی نازک ترین پرتوں کو سب سے گہرے انداز میں مجسم کر سکتی ہے۔ نظم محض ایک ادبی

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

ترکیب نہیں بلکہ ایک فکری مقام ہے جہاں زبان اپنی حدیں توڑ کر احساس کی سرحدوں تک جا پہنچتی ہے۔ نظم کے اندر موجود شعری کثافت، علامتی تاثر اور صوتی آہنگ، فرد کے ان تجربات کو پیش کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں جو عام زبان کے ذریعے مکمل طور پر بیان نہیں ہو سکتے۔ شاعری اور خصوصاً نظم میں جو "اظہار" پایا جاتا ہے، وہ در حقیقت فرد کی داخلی کیفیات، سوالات اور روحانی تناؤ کی عکس بندی ہے۔ نظم کسی واقعے، خیال یا جذبے کو محض بیان نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ جُڑنے والے فکری، نفسیاتی اور وجودی پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ عمل صرف جمالیاتی سطح پر خوشنما نہیں ہوتا بلکہ شعور میں اضطراب بھی پیدا کرتا ہے، جو قاری کو سوچنے، سمجھنے اور سوال کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ نظم کی یہ خصوصیت اُسے محض بیان سے بلند کر کے ایک فکری و حسی تجربے کی شکل دے دیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نظم، شعور اور تخلیق باہم گُندھ کر ایک ایسا ادبی اظہار پیدا کرتے ہیں جو نہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے بلکہ داخلی سطح پر جیا بھی جا سکتا ہے۔ ادب کا یہی عمل نظم میں سب سے زیادہ پیچیدگی کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے، کیونکہ یہاں شاعر صرف ایک منظر یا خیال کو پیش نہیں کرتا بلکہ ایک داخلی دنیا کو قاری کے لیے کھولتا ہے۔ یہ دنیا جذبات، خوف، امید، تنہائی، خودی، اور وقت جیسے سوالات سے عبارت ہوتی ہے۔ نظم کا قاری ایک ایسی فضا میں داخل ہوتا ہے جہاں وہ محض پڑھنے والا نہیں رہتا بلکہ خود بھی نظم کے باطن میں جھانکنے لگتا ہے۔ یہی جھانکنا نظم کے فکری اور وجودی پہلوؤں کو متحرک کرتا ہے، اور ادب کو ایک زندہ، حساس اور تفکر انگیز عمل میں بدل دیتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا(1)، "نظم اور اس کا پس منظر" میں رقمطراز ہیں:

"نظم بنیادی طور پر ایک صنف شعر ہے اور جب
تک ہم شعر کی تعریف، اس کی حدود کا تعین
اور اس کے اثرات کا محاکمہ کر لیں نظم کے بارے
میں کوئی نتیجہ اخذ کرنا یا نظم کے مزاج کو متعین
کرنا بہت مشکل ہوگا۔"

جب ادب خاص طور پر نظم جدیدیت کے دائرے میں داخل ہوئی تو اس کا مرکز "خارج" سے ہٹ کر "داخل" کی جانب منتقل ہونے لگا۔ اب نظم کا شاعر صرف ماحول، معاشرہ یا رومان کا نمائندہ نہیں رہا، بلکہ وہ ایک ایسا فرد بن گیا جو سوال کرتا ہے، متذبذب ہے، اور جس کا باطن مختلف تہوں میں منقسم ہے۔ اس تبدیلی نے نظم کو صرف

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

ایک فنکارانہ اظہار ہی نہیں بلکہ ایک فکری تجربہ بھی بنا دیا۔ جدید نظم کا شاعر خود کو ایک متحرک شعور کے طور پر دریافت کرتا ہے جو اپنے ہی سوالات، تضادات، خوابوں اور شکستگیوں کا سامنا کر رہا ہے۔ یہی داخلی سطح نظم کو اس کی شناخت دیتی ہے، اور یہی داخلی شعور نظم کے اسلوب، موضوعات اور علامتوں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ داخلی شعور کی یہ تشکیل محض انفرادی اظہار نہیں بلکہ ایک تخلیقی امکان بھی ہے۔ نظم اب صرف جذبات کے اظہار تک محدود نہیں بلکہ وہ شعور اور لاشعور کے درمیان موجود دھند کو لفظوں کی مدد سے واضح کرتی ہے۔ اس نظم میں وقت، خاموشی، روشنی، سایہ، خواب اور آئینہ جیسے عناصر کسی ایک سطح پر معنی نہیں رکھتے، بلکہ وہ قاری کو مسلسل تحریک دیتے ہیں کہ وہ ان علامتوں کے پیچھے موجود باطنی منطق کو سمجھے۔ نظم کا قاری اس تجربے میں اس وقت شریک ہو جاتا ہے جب وہ نظم کو محض الفاظ کے مجموعے کے طور پر نہیں بلکہ ایک فکری تجربے کے طور پر پڑھنے لگتا ہے۔ نظم کی یہی تخلیقی صلاحیت ہے جو اُسے ایک فلسفیانہ مظہر بناتی ہے۔ جدید نظم دراصل ایک مکالمہ ہے — فرد کا اپنے آپ سے، اپنے ماحول سے، اور وقت سے۔ یہ مکالمہ محض سوالات پر نہیں رکتا، بلکہ وہ ایک شعوری تحریک بھی پیدا کرتا ہے جو قاری کو اپنی ذات کے اندر جھانکنے پر مجبور کرتی ہے۔ نظم کا یہی پہلو اُسے ایک محض ادبی صنف سے آگے لے جا کر ایک فکری و روحانی تجربے میں تبدیل کرتا ہے۔ یوں نظم، خاص طور پر جدید نظم، صرف ادب نہیں بلکہ ایک داخلی کائنات ہے جس میں فرد اپنی معنویت، اپنی خودی اور اپنے خوف کے ساتھ زندہ ہوتا ہے۔ یہاں ادب محض لطافت نہیں، بلکہ ایک زندہ بیداری ہے — اور نظم اُس بیداری کا سب سے باریک اور دقیق اظہار ہے۔

نظم کے ارتقائی منظرنامے کو بیان کرتے ہوئے کوثر مظہری (2) لکھتے ہیں:

> "جدید نظم نگاری کی جو تحریک آزاد، اور حالی کے زمانے میں شروع ہوئی وہ اپنا کام کرتی رہی۔ آہستہ آہستہ موضوعاتی، اسلوبیاتی اور ہیئتی اعتبار سے تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں اور بیسویں صدی کی نئی شاعری بالخصوص جدید نظم نگاری کے لیے زمین ہموار ہوتی گئی۔ عام انسانی جذبات اور معاشرے کے حسن و قبح کو

کھل کر سچائی کے ساتھ پیش کرنے کی روش قائم
ہوئی۔"

وجودی فکر یا "Existentialism" ایک ایسا فلسفیانہ رجحان ہے جو انیسویں صدی کے وسط میں مغربی فلسفے میں ابھرا، لیکن اس کی جڑیں انسان کے ابتدائی فکری سوالات تک جاتی ہیں: میں کون ہوں؟ میں یہاں کیوں ہوں؟ میری زندگی کا مطلب کیا ہے؟ کیا میرا کوئی اختیار ہے؟ کیا میں مکمل آزاد ہوں؟ یہ سوالات اگرچہ ازل سے انسانی شعور کا حصہ رہے ہیں، مگر جدید دور میں انہوں نے ایک منظم فکری اور فلسفیانہ تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ سورن کیرکیگارڈ (Søren Kierkegaard) کو عام طور پر اس رجحان کا ابتدائی بانی مانا جاتا ہے، جنہوں نے فرد کی "داخلی صداقت" کو مذہبی اصولوں سے بالاتر مانتے ہوئے خودی، تنہائی، اور انتخاب کی اہمیت پر زور دیا۔ کیرکیگارڈ کے نزدیک اضطراب ایک منفی کیفیت نہیں، بلکہ وہ تخلیقی اور داخلی لمحہ ہے جہاں فرد اپنی آزادی، امکانات، اور خودی کی تشکیل کے چیلنج سے پہلی بار واقف ہوتا ہے۔ یہی "اضطراب" وجودی فکر کا ابتدائی تجربہ ہے — وہ کیفیت جس سے انسان کی خودی جنم لیتی ہے۔ کیرکیگارڈ (3) لکھتی ہے:

"اضطراب دراصل آزادی کی چکر آور کیفیت ہے،
جو اس وقت ابھرتی ہے جب روح اپنی حقیقت کی
تشکیل چاہتی ہے، اور آزادی اپنی ممکنہ وسعت میں
جھانکتی ہے، اور اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لیے کسی
محدود پہلو کو تھام لیتی ہے۔"

فریڈرک نطشے (Friedrich Nietzsche) وجودی فلسفے کے ان بنیاد گزار مفکرین میں شامل ہیں جنہوں نے انسان کی داخلی قوت، اخلاقی آزادی، فرد کی خودی، اور "خدا کی موت" جیسے تصورات کے ذریعے جدید فکر کو جھنجھوڑا۔ نطشے نے انسان کو اُس کی روایتی اور مذہبی غلامی سے نکال کر ایک خودمختار اور معنی تخلیق کرنے والا وجود قرار دیا، نطشے (4) کے مطابق:

"وہ بنو جو تم ہو! وہ کرو جو صرف تم ہی کر سکتے ہو۔ اپنے آپ
کے مالک اور مجسمہ ساز بنو۔"

بیسویں صدی میں یہ فکر مزید منظم ہوئی جب ژاں پال سارتر (Jean-Paul Sartre)، مارٹن ہائیڈیگر (Martin Heidegger)، البرٹ کامو (Albert Camus)، اور کارل یاسپرز (Karl

Jaspers) جیسے مفکرین نے وجودیت کو محض فلسفیانہ گفتگو تک محدود رکھنے کے بجائے انسانی تجربے، آزادی، جبر، اور اضطراب کے نفسیاتی و معاشرتی پہلوؤں سے جوڑ دیا۔

سارترے (5) لکھتا ہے:

> "انسان وہی کچھ ہے جو وہ خود اپنے لیے بناتا ہے اور یہی وجودیت کا پہلا اصول ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان پہلے وجود میں آتا ہے، خود سے ٹکراتا ہے، دنیا میں اُبھرتا ہے اور بعد میں اپنی تعریف خود طے کرتا ہے۔

ان مفکرین کے نزدیک انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ نہیں کہ وہ زندہ ہے، بلکہ یہ کہ وہ کیوں زندہ ہے اور اس زندگی کو کیسے معنی دار بنائے۔ وہ فرد کو مکمل آزاد تسلیم کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ باور بھی کرواتے ہیں کہ یہ آزادی ذمہ داری، خوف، اور الجھن کے ساتھ مشروط ہے۔ "وجود، ماہیت سے پہلے ہے" کا مشہور جملہ سارتر کا ہے، جس میں اس نے فرد کو خود اپنا معنی بنانے والا عامل قرار دیا۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جہاں وجودی فکر دوسرے فلسفوں سے مختلف ہو جاتی ہے؛ یہ فرد کو مرکز بناتی ہے، معاشرے، مذہب یا روایات کو نہیں۔

وجودیت کے مطابق، فرد دنیا میں کسی خاص مقصد کے ساتھ نہیں آتا بلکہ اُسے خود اپنے وجود کا مطلب بنانا ہوتا ہے۔ اس کا ہر انتخاب، ہر عمل، اور ہر خیال اُس کے وجود کی تشکیل کا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ عمل نہایت خوف، بے یقینی اور "وجودی اضطراب (Existential Anxiety) " سے گزرتا ہے کیونکہ کوئی خارجی اتھارٹی فرد کی رہنمائی نہیں کرتی۔ یہ اضطراب انسان کے "تنہا ہونے" کا شعور ہے — ایک ایسا تنہائی کا لمحہ جو صرف سماجی نہیں بلکہ فکری اور روحانی بھی ہے۔ فرد اس وقت خود کو مکمل ننگا محسوس کرتا ہے جب وہ یہ جان لیتا ہے کہ وہی اپنی تقدیر کا ذمہ دار ہے، اور اسی لمحے اس کا شعور جاگتا ہے۔

ادب، خصوصاً شاعری اور نظم، نے وجودی فکر کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے تخلیقی سطح پر بیان کرنے کا ایک بھرپور وسیلہ بنایا۔ اگر فلسفے نے وجودیت کو سوچنے اور سمجھنے کی زبان دی، تو ادب نے اسے محسوس کرنے اور جینے کا پیرایہ عطا کیا۔ بیسویں صدی کے ادب میں یہ رجحان نہایت شدت سے ظاہر ہوا، خاص طور پر دوسری جنگِ عظیم کے

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

بعد، جب انسان نے مذہب، تہذیب اور سائنس کے روایتی سہاروں کو بے اثر پایا۔ یہ وہ دور تھا جب فرد تنہا ہو چکا تھا، شناخت بکھر رہی تھی، اور معنی تحلیل ہو چکے تھے۔ اس فکری خلا کو پر کرنے کے لیے شاعری نے اپنے اندر وہ توانائی پیدا کی جو فرد کے وجودی تجربے کو علامت، تجرید اور شعری اظہار کی شکل میں بیان کر سکے۔ اب نظم صرف جذبے کا اظہار نہیں رہی، بلکہ شعور، احتجاج، تنہائی، خوف، بیداری، اور خودی کی دریافت کا ذریعہ بن گئی۔ وجودی فکر نے نظم کو ایک نئے دائرہ کار میں داخل کیا، جہاں شاعر محض فطرت یا عشق کی رومانویت نہیں بیان کرتا بلکہ انسان کے اس باطنی سفر کو نظم کا موضوع بناتا ہے جو وہ اپنی تنہائی میں طے کرتا ہے۔ نظم اب خارجی واقعے کی توسیع نہیں بلکہ داخلی حقیقت کی تہہ میں جھانکنے کا عمل بن گئی۔ "موت"، "خاموشی"، "وقت"، "سایہ"، "راستہ"، "آدمی"، "خوف"، اور "آواز" جیسے الفاظ نظم میں صرف لفظ نہیں بلکہ وجودی علامتیں بن گئیں۔ قاری نظم کے ذریعے ایک ایسے سفر میں شریک ہوتا ہے جہاں وہ صرف خیال یا جذبات سے واسطہ نہیں رکھتا بلکہ اپنے ہی وجود کے امکانات، شکستگی، اور نجات کی صورتوں سے روبرو ہوتا ہے۔ ادب نے وجودیت کو تخلیقی امکانات کے ساتھ یوں مربوط کیا کہ اب نظم محض ذاتی اظہار کی صنف نہیں رہی، بلکہ ایک فکری تحریک، ایک مزاحمتی صدا اور ایک داخلی استدلال کی صورت اختیار کر گئی۔ جدید نظم، جس کی بنیاد فرد کی داخلی سچائی اور فکری آزادی پر ہے، دراصل وجودی فکر کا سب سے جمالیاتی اظہار یہ ہے۔ یہ نظم قاری کو وہ دروازہ فراہم کرتی ہے جس سے گزر کر وہ خود اپنے وجود کے بحران کو محسوس کر سکتا ہے۔ اسی لیے جدید نظم اکثر سوال کرتی ہے، بیان نہیں دیتی؛ وہ قارئین کو اجتناب کی فضا سے نکال کر بیداری کی دہلیز پر لا کھڑا کرتی ہے۔

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

تھامس آر فلانن(6) رقمطراز ہے:

"ادب وجودی اضطراب کے لیے ایک پناہ گاہ بن جاتا ہے— ایک ایسی جگہ جہاں فرد زندگی کی بے معنویت، آزادی کی دہشت، اور انتخاب کے بوجھ کا سامنا زبان، استعارے اور بیانیے کے ذریعے کر سکتا ہے۔"

اردو شاعری کی جدید تحریک میں ن م راشد محض ایک تکنیکی مصلح یا اسلوبی مجدد نہیں بلکہ ایک فکری سطح پر بیدار اور ذمہ دار تخلیق کار کے طور پر سامنے آئے، جنہوں نے نظم کو محض صنفی تجربے، عروضی آزادی یا روایتی موضوعات کے دائرے میں قید نہیں رکھا، بلکہ اسے ایک وجودی مکالمے کی شکل دی۔ راشد کی نظم میں لفظ محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ ایک فکری کشف (intellectual revelation) ہے، جو انسان کے باطن میں چھپے اُس ادراک، الجھن اور اضطراب کو سامنے لاتا ہے جو روایتی بیانیے میں عموماً دبا رہتا ہے۔ ان کی شاعری اس نوعیت کی تخلیق ہے جہاں فرد، اپنی داخلی ساخت، تنہائی، انتخاب، خوف اور خودی کے سوالات سے براہِ راست ہمکلام ہوتا ہے۔ یہ فرد کسی مہذب سماجی شناخت کا نمائندہ نہیں بلکہ ایک متذبذب، تشکیک زدہ اور فکری طور پر آزاد شعور ہے، جو اپنی حقیقت کو خود دریافت کرنا چاہتا ہے۔ راشد کے ہاں فرد کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک ایسے انسان کی ہے جو خارجی دنیا سے کٹا ہوا، لیکن اپنے اندر کی دنیا سے جڑا ہوا ہے۔ یہی باطنی وابستگی اس کے شعور کو غیر معمولی بنا دیتی ہے۔ راشد کی نظموں میں فرد کا "میں" اس مقام پر پہنچ چکا ہوتا ہے جہاں وہ نہ صرف اپنے آپ سے سوال کرتا ہے بلکہ سماجی، مذہبی اور تہذیبی حوالوں سے بھی کٹ کر خالص داخلی صداقت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ اس لیے راشد کی شاعری کو محض نظمِ معریٰ یا آزاد نظم کے فنی تجربے کے طور پر دیکھنا، اس کے اصل فکری جوہر سے انکار کے مترادف ہے۔ ان کے یہاں شعری زبان ایک تخلیقی تجربہ ہے جو نہ صرف صوتی یا بصری حُسن رکھتی ہے، بلکہ لاشعور میں پیوست سوالات، خدشات، اور امکانات کو علامت، تکرار، سوالیہ لہجے، اور تجریدی فضا کے ذریعے سطح پر لاتی ہے۔ راشد کی نظمیں صرف فرد کی ذات کا بیان نہیں بلکہ اجتماعی فکری بحران کی نشاندہی بھی ہیں، جہاں فرد کی خاموشی ایک معاشرتی مسئلہ بن جاتی ہے، اور

اس کا بیدار شعور تخلیقی مزاحمت کی علامت۔ "زندگی سے ڈرتے ہو" اسی بیداری کی ایک مکمل شعری تصویر ہے۔

(2)

اردو نظم میں اگر کسی شاعر نے وجودی فکر کو نہ صرف جذب کیا بلکہ اسے اپنے تخلیقی تجربے کا مرکزی حوالہ بنایا، تو وہ ن م راشد ہیں۔ ان کی شاعری محض جدید اسلوب یا آزاد نظم کی تکنیکی تشکیل نہیں، بلکہ ایک مکمل فکری نظام کی نمائندہ ہے جس کی جڑیں فرد کے داخلی کرب، شعوری کشمکش، اور روحانی بے قراری میں پیوست ہیں۔ راشد کا شعری کینوس وسیع بھی ہے اور عمیق بھی، جہاں فرد کسی خارجی عقیدے یا روایتی دائرہ کار کا اسیر نہیں بلکہ خود اپنا خالق، ناقد اور نجات دہندہ ہے۔ ان کی نظموں میں بارہا وہ لمحے سامنے آتے ہیں جہاں انسان، اپنے سماجی کردار سے الگ ہو کر، ایک تنہا، سوچتا ہوا، اور اپنے وجود پر سوال اٹھانے والا شعور بن جاتا ہے۔ یہ شعور محض اضطراری ردعمل نہیں بلکہ ایک فکری جستجو ہے، جسے نظم کی صورت میں علامتی، تجریدی اور صوتی پیرایے میں ڈھالا گیا ہے۔ن م راشد کے ہاں فرد کا تصور کلاسیکی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ وہ نہ محبوب ہے، نہ عاشق، نہ درویش، اور نہ کوئی تہذیبی استعارہ؛ وہ ایک متذبذب، سوال کرنے والا، غیر مطمئن اور شعوریافتہ انسان ہے، جو اپنی حقیقت کے تعین میں مصروفِ جدوجہد ہے۔ یہی وہ داخلی سفر ہے جسے وجودی فکر میں "خودی کی تشکیل" (Formation of Authentic Self) کہا جاتا ہے۔ راشد کی شاعری میں یہ خودی کسی الوہی یا ماورائی سہارے کی محتاج نہیں بلکہ اپنے تجربے، اپنی کشمکش اور اپنی زبان سے جنم لیتی ہے۔ ان کے ہاں فرد کا باطن ایک مسلسل کشمکش کا میدان ہے جہاں کبھی خاموشی بولتی ہے، کبھی روشنی ڈراتی ہے، کبھی "ان کہی" کا خوف ابھرتا ہے، اور کبھی "ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں" — گویا عمل، بغاوت، اور آگہی ایک نئے شعری منطق کی تشکیل کرتے ہیں۔ راشد کی نظموں میں ہم ایک ایسی آواز سنتے ہیں جو روایتی نظموں کے جمالیاتی نمونوں سے ہٹ کر، شعور کے اس گہرے کنویں میں اترتی ہے جہاں وجودی سوالات گونجتے ہیں: میں کون ہوں؟ میری ذات کا محور کیا ہے؟ کیا میں آزاد ہوں؟ کیا میری خاموشی بزدلی ہے یا فکری تخلیق کا مقدمہ؟ ایسے سوالات صرف فلسفے کی کتابوں میں نہیں بلکہ راشد کی نظموں میں بھی بار بار ابھرتے ہیں، اور قاری کو محض تاثر یا جذبے کی سطح پر متاثر نہیں کرتے بلکہ فکری مکالمے میں شریک کرتے ہیں۔ ارتضیٰ کریم (7) لکھتے ہیں:

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

"اردو ادب میں مزاحمت اور احتجاج کے رویے یا
اس کی صورت حال یا اس کے طریقۂ کار یا
اس کی لے - آپ جس طرح بھی کھیں، اس کا
مفہوم بہت واضح ہے۔ زیر نظر کتاب میں جو
مضامین شامل کیے گئے ہیں، ان کے حوالے سے اسی
گفتگو کو آگے بڑھانے کی اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی
ھے کہ اردو ادب میں مزاحمت اور احتجاج کے
رویے کی نوعیت کیا رھی ھے۔ "

ن م راشد(8) کی نظم "زندگی سے ڈرتے ہو" اس شعری موقف کی سب سے بھرپور مثال ہے، جس میں فرد کو اُس کے خاموش خوف، اس کی لاتعلقی، اور اس کے امکانات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اس نظم کا ہر سوال دراصل ایک چیلنج ہے: فرد کے شعور کو، اس کی نیند کو، اور اس کی فکری سستی کو۔ یہ نظم قاری کے باطن میں ایک ایسی بیداری پیدا کرتی ہے جو محض لفظی نہیں بلکہ فکری اور روحانی سطح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ نظم صرف موضوعاتی سطح پر اہم نہیں بلکہ اس کی ساخت، علامتیں، صوتی آہنگ اور سوالیہ بیانیہ اُسے ایک باقاعدہ فکری تجربہ بنا دیتے ہیں۔ نظم میں استعمال ہونے والے الفاظ، سوالات اور پیکر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ شاعر فرد کو نہ صرف اس کی خاموشی اور لاتعلقی کا احساس دلا رہا ہے، بلکہ اسے ایک فکری جھٹکا دینے کی کوشش بھی کر رہا ہے تاکہ وہ اپنی وجودی حیثیت اور داخلی قوت کو دریافت کر سکے۔ نظم کا مطالعہ اس زاویے سے پیش کیا جائے گا کہ وہ فرد کو کس طرح اس کے داخلی خوف، انتخاب کی آزادی، اور اظہار کی قوت سے روشناس کراتی ہے۔ اس تجزیے میں نظم کے فکری نظام، اسلوبیاتی اظہار، اور علامتی کثافت کو تحقیقی اصولوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

نظم "زندگی سے ڈرتے ہو" کی پہلی سطر نہ صرف اس تخلیق کا تمہیدی دروازہ ہے بلکہ ایک ایسا فکری ارتعاش ہے جو قاری کے ذہنی سکون کو منتشر کرتا ہے۔

"زندگی سے ڈرتے ہو؟"

یہ محض سوال نہیں بلکہ ایک وجودی مقدمہ ہے، ایک نفی شدہ دعویٰ جو لاشعور کو براہِ راست جھنجھوڑتا ہے۔ شعری ساخت کے اعتبار سے یہاں شاعر نے خطیبانہ انداز اپنایا ہے،

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

جس میں براہِ راست خطاب (Direct Address) کے ذریعے فرد کی داخلی دنیا کو متحرک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس اسلوبی تکنیک کے ذریعے شاعر اور قاری کے درمیان ایک ایسا مکالمہ آغاز ہوتا ہے جس کی بنیاد خوف، اختیار، انتخاب، اور وجود جیسے کلیدی فلسفیانہ مفاہیم پر رکھی گئی ہے۔"زندگی" کا تصور یہاں صرف biological survival یا روزمرہ کے معمولات کی نمائندگی نہیں کرتا، بلکہ یہ لفظ علامتی معنویت (Symbolic Density) سے بھرا ہوا ہے۔ زندگی، بطور ایک فکری و جمالیاتی استعارہ، ان تمام امکانات، خطرات، فیصلوں، تنہائیوں اور سوالات کا مظہر ہے جن سے انسان کا شعور روزانہ کی بنیاد پر نبرد آزما ہوتا ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جو خودی کی تخلیق، اقدار کی تشکیل، اور معنویت کی تلاش سے عبارت ہے۔ چنانچہ شاعر کا سوال، دراصل فرد سے یہ استفسار ہے کہ کیا تم اس "زندگی" سے ڈرتے ہو جو تمہیں مکمل آزادی دیتی ہے، مگر اس آزادی کے ساتھ ذمہ داری بھی لادتی ہے؟ وجودی فلسفے میں "آزادی (Freedom)" کا تصور دوہرا ہوتا ہے: ایک طرف یہ فرد کو اختیار عطا کرتی ہے، تو دوسری طرف یہ اسے تنہا کر دیتی ہے، کیونکہ کوئی بالاتر ہدایت یا کائناتی منصوبہ اسے رہنمائی فراہم نہیں کرتا۔ یہی وہ لمحہ ہے جسے ژاں پال سارتر "existential anguish" کہتا ہے، اور مارٹن ہائیڈیگر اسے "thrownness" (دُنیا میں پھینکے جانے کا شعور) سے تعبیر کرتے ہیں۔ راشد کے یہاں یہی کیفیت پہلے ہی مصرعے میں سامنے آتی ہے — جب شاعر فرد سے سوال کرتا ہے تو وہ اس کے شعور میں چھپی ہوئی وجودی انزائٹی (Existential Anxiety) کو آواز دیتا ہے۔

ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سوال dramatic monologue کی تکنیک سے بھی قریب ہے، جس میں نظم کا راوی قاری کو کسی پردے کے پیچھے نہیں چھپنے دیتا بلکہ اُسے فکری طور پر عریاں کر دیتا ہے۔ یہاں سوال پوچھنے والا صرف شاعر نہیں، بلکہ وہ شعور ہے جو ہر فرد کے اندر موجود ہے، مگر جسے سماج، روایت، یا عقیدہ اکثر خاموش کرا دیتا ہے۔ "زندگی سے ڈرتے ہو؟" کا سوال ایک performative utterance بھی ہے، یعنی یہ محض اظہار نہیں بلکہ عملی مطالبہ بھی ہے؛ یہ سوال دراصل قاری کو عمل پر آمادہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ نظم کے داخلی ڈھانچے میں ایک انقلابی تھیم کی ابتدا ہے، جہاں شاعر صرف مخاطب کو آئینہ نہیں دکھاتا بلکہ اُسے اپنے خوف سے باہر نکلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس مصرعے کی صوتی ساخت بھی قابلِ توجہ ہے۔ "زندگی" اور "ڈرتے ہو" ؛ دونوں میں ایک

ارتعاشی تسلسل ہے، جو شعور میں لرزش پیدا کرتا ہے۔ یہ محض موسیقیت نہیں بلکہ معنوی جھٹکا ہے، جو قاری کو نظم کے فکری میدان میں گھسیٹ لاتا ہے۔

"آدمی سے ڈرتے ہو؟

آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں

آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے

اس سے تم نہیں ڈرتے"!

یہ مصرعے نظم کو محض فرد کی خاموشی یا لاتعلقی کے اظہار سے آگے لے جا کر اجتماعی وجود، تخلیقی قوت، اور شعور کے اظہاری پہلو کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ یہاں "آدمی" بطور علامتِ شعور سامنے آتا ہے۔ راشد "آدمی" کو محض حیاتیاتی یا معاشرتی ہستی کے طور پر نہیں، بلکہ شعوری، اظہاری اور فکری قوت کے حامل وجود کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پہلے سوال "آدمی سے ڈرتے ہو؟" میں شاعر دوبارہ خطیبانہ انداز اپناتا ہے، لیکن اس بار "زندگی" کی بجائے "آدمی" کی صورت میں فرد کو اپنے جیسے انسان سے روبرو کرتا ہے۔ یہ سوال کسی خارجی قوت یا طاقتور نظام سے متعلق نہیں، بلکہ اسی ذات کے عکس سے متعلق ہے جو قاری کے اندر موجود ہے۔ وجودی فکر میں "خود سے خوف (fear of self)" ایک گہرا مفہوم رکھتا ہے، جہاں انسان اپنے ہی فیصلوں، اختیارات اور ممکنہ امکانات سے خائف ہوتا ہے۔ راشد اس نکتے کو شاعرانہ پیرائے میں اس طور پیش کرتے ہیں کہ "آدمی" کے معنی صرف دوسرا انسان نہیں بلکہ "خود اپنی ذات" بھی ہیں۔

"آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے" — یہ مصرعے شاعر کے فکری اسلوب کی لسانیاتی جہت (linguistic consciousness) کو آشکار کرتے ہیں۔ یہاں "زباں" محض کلام کا ذریعہ نہیں بلکہ شعور، اظہار، اور فکری آزادی کا نشان ہے۔ "بیاں" وہ سطح ہے جہاں فرد محض محسوس نہیں کرتا بلکہ خود کو ظاہر کرتا ہے — یعنی منکشف وجود (revealed self)۔ ادبی تنقید میں یہ مفہوم expressionism کے اصولوں سے قریب تر ہے، جہاں فن کار یا فرد اپنی باطنی حقیقت کو علامتی زبان کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ راشد کے ہاں "آدمی" اس لیے اہم ہے کہ وہ "زباں" رکھتا ہے — وہ خاموش نہیں، بلکہ بیاں کی قوت رکھتا ہے۔ یہی بیاں تخلیق کی بنیاد ہے، اور یہی شعور کی فعّالیت کا مظہر۔ اس مقام پر نظم فرد سے اجتماعی کی طرف متحرک ہوتی ہے۔ "ہم بھی ہیں" کہہ کر شاعر قاری کو اس کے انفرادی قفس سے نکال کر اجتماعی شعور سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے، گویا قاری اکیلا نہیں بلکہ ایک فکری برادری کا

حصہ ہے۔ یہ وجودی ہم آہنگی (existential solidarity) نظم کا وہ پہلو ہے جو صرف سوال کرنے پر نہیں بلکہ مکالمے کی فضا میں فرد کو کھولنے پر زور دیتا ہے۔ شاعر جب کہتا ہے:

"اس سے تم نہیں ڈرتے!"

تو یہ ایک تہہ دار طنز ہے — جو فرد کی اس متضاد ذہنیت کو بے نقاب کرتا ہے جہاں وہ اپنی اصل طاقت، یعنی "زبان" اور "اظہار" سے تو نہیں ڈرتا، مگر زندگی، انتخاب اور شعور سے خائف ہے۔ یہ سوال گویا قاری کے لاشعور میں چھپی ہوئی اخلاقی بے عملی کو اجاگر کرتا ہے۔راشد کے اسلوب میں یہاں جدلیاتی کشمکش (dialectical tension)موجود ہے — ایک طرف فرد کی خاموشی، دوسری طرف اظہار کی قوت؛ ایک طرف خوف، دوسری طرف شناخت؛ ایک طرف "تم"، دوسری طرف "ہم"۔یہی کشمکش نظم کو فکری تحریک بناتی ہے اور قاری کو محض سامع نہیں، شریکِ سوال بنا دیتی ہے۔

"حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے
'ان کہی' سے ڈرتے ہو!"

نظم کا یہ حصہ زبان، شعور، اور وجود کے مابین رشتوں کو انتہائی گہرائی سے بیان کرتا ہے۔ یہاں "آدمی" ایک ایسی ہستی کے طور پر سامنے آتا ہے جو "حرف" (لفظ) اور "معنی" (مفہوم) کے ذریعے نہ صرف خود کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اپنی زندگی کی تعبیر بھی تخلیق کرتا ہے۔ یہ مصرع محض لسانی یا شعری بیان نہیں، بلکہ اس میں ایک واضح فلسفیانہ کثافت موجود ہے۔"رشتہ ہائے آہن" کا استعمال یہاں خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ "آہن" یعنی فولاد سے مراد وہ مضبوط، گہرا اور ناقابلِ انکار رشتہ ہے جو انسان اور زبان کے درمیان قائم ہے۔ وجودی فکر میں زبان نہ صرف اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے، بلکہ وہ انسان کے وجود کی تعمیر کا وسیلہ بھی ہے۔ جیسا کہ ہائیڈیگر نے کہا — Language is the house of being: اور راشد یہاں اسی فکر کو شاعرانہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ آدمی کے وجود کی جڑیں حرف و معنی سے پیوست ہیں۔ادبی تنقید میں یہ تصور linguistic existentialism کے دائرے میں آتا ہے، جہاں زبان انسان کی پہچان کا، اس کے شعور کا، اور اس کی داخلی ساخت کا آئینہ بن جاتی ہے۔راشد کا "آدمی" حرف کے بغیر ادھورا ہے، اور "معنی" کے بغیر بے منزل۔ اس کا وجود

محض خاموشی میں نہیں بلکہ شعورِ اظہار میں مکمل ہوتا ہے۔ چنانچہ زندگی اور آدمی کا تعلق "دامن" کے استعارے سے بیان کر کے شاعر نے یہ باور کروایا کہ زندگی کی اصل معنویت آدمی کے اظہار اور آگہی سے مشروط ہے۔

اس کے بعد شاعر دوبارہ سوال کرتا ہے:

"اس سے تم نہیں ڈرتے
'ان کہی' سے ڈرتے ہو؟"

یہاں شاعر وجودی فکر کا سب سے اہم مسئلہ سامنے لاتا ہے: نامعلوم کا خوف۔ "ان کہی" — یعنی وہ جو ابھی کہا نہیں گیا، جو لاشعور میں چھپا ہوا ہے، جو ابھی تک ظاہر نہیں ہوا — وہ دراصل وہی شعوری سچ ہے جس سے فرد انکاری ہے۔ راشد کا یہ سوال اس ذہنی جبر کو توڑتا ہے جو فرد کو اظہار سے باز رکھتا ہے۔ "ان کہی" صرف ایک نظم یا جملہ نہیں، بلکہ وہ ممکنہ زندگی ہے جو فرد جینے سے خوف زدہ ہے۔ وجودی اصطلاح میں یہ کیفیت "dread of becoming" کہلاتی ہے — یعنی انسان اپنی ذات کے مکمل انکشاف، امکانات، یا تبدیلی سے ڈرتا ہے، کیونکہ یہ تبدیلی اس کے موجودہ وجود کو چیلنج کرتی ہے۔ راشد اس خوف کی جڑ کو نظم میں لا کر قاری سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف اس "ان کہی" کا سامنا کرے، بلکہ اسے اپنی زبان دے، اسے حقیقت بنائے۔ یہ اشعار نظم کے اندر ایک معنیاتی تناؤ (semantic tension) پیدا کرتے ہیں — ایک طرف "کہا ہوا"، جو محفوظ، مانوس اور شعوری ہے؛ دوسری طرف "ان کہی"، جو آزاد، بے ساختہ، اور غیر متعین ہے۔ راشد چاہتے ہیں کہ فرد "ان کہی" کو اپنے شعور میں جگہ دے تاکہ اس کا وجود مکمل ہو۔ یہ لمحہ نظم کے وجودی بحران کی انتہا ہے: ایک طرف اظہار، دوسری طرف خاموشی؛ ایک طرف شناخت، دوسری طرف انکار؛ ایک طرف زندگی، دوسری طرف زندگی کا خوف۔ نظم قاری کو مجبور کرتی ہے کہ وہ خود یہ انتخاب کرے — کیا وہ "حرف و معنی" کے آہنی رشتے کو قبول کرے گا یا "ان کہی" کی دھند میں گم رہے گا؟

"پہلے بھی تو گزرے ہیں
دورِ نارسائی کے، 'بے ریا' خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو، ہیچ آرزومندی
یہ شب زباں بندی ہے، رہِ خداوندی!"

یہ اشعار نظم کو ایک تاریخی اور تہذیبی تناظر میں داخل کرتے ہیں، جہاں شاعر فرد کی خاموشی اور لاتعلقی کو کسی ذاتی کیفیت کے بجائے ایک تاریخی جمود کا تسلسل قرار دیتا ہے۔ نظم یہاں اپنی سابقہ سطح — یعنی فرد اور اس کے داخلی خوف — سے بلند ہو کر اجتماعی فکری تاریخ کا جائزہ لیتی ہے، اور ایک مخصوص مذہبی و ثقافتی ذہنیت پر تنقید کرتی ہے جس نے انسان کو خاموش رہنے، سچ نہ بولنے، اور سوال نہ اٹھانے کی عادت دی ہے۔"دورِ نارسائی" اور "بے ریا خدائی" — یہ ترکیبیں صرف زمانوں یا عقائد کی طرف اشارہ نہیں کرتیں بلکہ ایک نفسیاتی اور فکری صورتِ حال کی نشاندہی کرتی ہیں جہاں فرد کی رسائی، آگہی، اور خود اختیاری کو ایک مقدس مگر جامد ساخت میں قید کر دیا گیا ہو۔ راشد یہاں ماضی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے موجودہ رویے پر تنقید کرتے ہیں: گویا، تمہاری خاموشی کوئی روحانی کمال نہیں، بلکہ آرزومندی کا انکار اور شعور کی پسپائی ہے۔"ہیچ آرزومندی" کا مفہوم نہایت فلسفیانہ ہے۔ آرزو، جو کہ انسان کی زندگی میں تخلیقی تحریک، امکان، جستجو اور ارتقاء کی علامت ہے، اُسے "ہیچ" کہنا دراصل زندگی کے امکانات سے دستبرداری ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جسے وجودی فکر میں "نیہلزم (Nihilism)" کہا جاتا ہے — یعنی جب انسان کسی بھی معنی، مقصد یا جستجو سے انکار کر دیتا ہے اور مکمل انفعالی کیفیت کو قبول کر لیتا ہے۔

راشد اس صورت حال پر شدید تنقیدی موقف اختیار کرتے ہیں۔ نظم کا اگلا مصرع:

"یہ شب زباں بندی ہے، رہِ خداوندی"!

نہایت اہم فکری و لسانی علامت ہے۔"شب زباں بندی" ایک گہری صوتی اور فکری تصویر ہے — ایک ایسی رات جس میں زبان خاموش ہو چکی ہے، مکالمہ مفقود ہے، اور شعور ساکت ہے۔ شاعر اس خاموشی کو "رہِ خداوندی" سمجھنے کی عمومی روش پر تنقید کرتے ہیں۔ گویا یہ وہ فکری خاموشی ہے جسے روحانی، مذہبی یا اخلاقی جواز دے کر انسانی آزادی، سوال، اور بغاوت کو دبایا گیا ہے۔ وجودی تناظر میں یہ وہ مقام ہے جہاں مذہب یا روایت فرد کو سوال اٹھانے سے روکتی ہے، اور انسان اپنے خوف کو تقدس میں لپیٹ کر اس پر رضامندی ظاہر کرتا ہے۔ راشد کی نظم یہاں اخلاقی جبر، مقدس خاموشی، اور نارسائی کو شعوری طور پر رد کرتی ہے، اور فرد کو یہ باور کرواتی ہے کہ اس کی خاموشی کوئی تقدیر نہیں بلکہ اختیار کردہ بے عملی ہے۔ اس مقام پر نظم کا لہجہ صرف سوالیہ نہیں بلکہ احتجاجی اور انکشاف انگیز ہو جاتا ہے۔ شاعر فرد کے ذہن میں چھپے فکری دھوکے کو بے نقاب کرتا ہے — وہ دھوکہ جس میں فرد اپنی بزدلی کو تقدس کا لباس پہنا کر تسکین

حاصل کرتا ہے۔ادبی اعتبار سے یہ اشعار نظم کے اندر ایک عرفانی تنقید کی صورت اختیار کرتے ہیں، جہاں "خدائی"، "رہ"، اور "شب" جیسے الفاظ تصوف، روایت، اور مذہب کے کلاسیکی پیرایوں کو توڑ کر ایک نئے فکری سیاق میں رکھے گئے ہیں۔ راشد ان الفاظ کو دوبارہ معنی دینے (resemanticize) کا عمل انجام دیتے ہیں، جس سے نظم کا معنوی تناؤ گہرا ہو جاتا ہے۔

"تم مگر یہ کیا جانو
لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں، راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر"...

یہ اشعار نظم کی فکر اور اس کے بیانیے میں ایک واضح وجودی موڑ (existential shift) پیدا کرتے ہیں۔ اگر نظم کے ابتدائی حصے میں فرد کی خاموشی، انکار، خوف، اور نارسائی کو آشکار کیا گیا، تو یہاں شاعر اُس کے باطن میں امکان، مزاحمت اور اظہار کی قوت کو پیش کرتا ہے۔ یہاں "ہاتھ" صرف جسمانی عضو نہیں بلکہ ایک عملی شعور (active consciousness) کی علامت بن جاتے ہیں۔پہلی سطر "تم مگر یہ کیا جانو" ایک ادبی طنز کے ساتھ فکری درجہ بندی قائم کرتی ہے: جو خاموش ہے، وہ بیدار ہونے والے ہاتھوں کی معنویت نہیں جان سکتا۔ راشد یہاں "زبان" اور "ہاتھ" کو دو سطحوں پر رکھتے ہیں: "زبان" جو خاموش ہو چکی ہے، اور "ہاتھ" جو بولنے لگے ہیں۔ یہ تخلیقی مزاحمت (resistance through action) کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ وجودی فکر کے مطابق، جب فرد کسی بھی بیرونی نظام یا داخلی خوف کی وجہ سے اظہارِ رائے سے قاصر ہو، تو اس کی وجودی سچائی عمل کے ذریعے سامنے آتی ہے۔"ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں" — یہ مصرع ایک حرکی پیکر ہے، جو داخلی بیداری کو جسمانی مظاہر میں بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔ یہاں ہاتھ صرف احتجاج نہیں بلکہ راہ کا نشاں بن جاتے ہیں — یعنی وہ رہبری، راستہ سازی اور نئ فکر کی تشکیل کا عمل انجام دیتے ہیں۔ اس علامت میں کیا جانے والا عمل ایک مقدس سرگرمی میں بدل جاتا ہے۔

"نور کی زباں بن کر"

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

یہ مصرع راشد کی فکر میں اظہار اور روشنی کی وحدت کو ظاہر کرتا ہے۔"نور" یہاں محض روحانیت یا تجلی کی علامت نہیں بلکہ عقلی اور شعوری روشنی ہے۔ یہ وہ "روشنی" ہے جو فرد کے اندر سے پھوٹتی ہے — علم، فہم، صداقت، اور بیداری کی علامت۔ "نور کی زباں" کا مطلب ہے وہ زبان جو سچائی اور شعور سے پیدا ہوئی ہو — جو خالص ہو، جو جرات مند ہو، جو ذات کی گہرائیوں سے نکلی ہو۔

"ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر"...

یہ نظم کا انتہائی جمالیاتی اور علامتی نقطۂ عروج ہے۔ "اذاں" کا استعارہ یہاں محض مذہبی نہیں بلکہ شعوری بیداری، فکری صداقت، اور اجتماعی دعوت کا نمائندہ ہے۔ "صبح کی اذاں" وہ صدا ہے جو تاریکی میں کٹاؤ، جمود میں حرکت، اور خاموشی میں روشنی لاتی ہے۔ یہاں "ہاتھ" بولنے لگتے ہیں، یعنی فرد اپنے عمل، اپنے جسم، اور اپنی موجودگی سے ایک نئی صدائے بیداری بلند کرتا ہے۔ ادبی و تنقیدی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ پورا بند Kinetic Symbolism، Imagery اور Performative Expression کا حسین امتزاج ہے۔ یہاں نظم قاری کو passive سامع سے active عمل کرنے والے میں تبدیل کرنے کی شعوری کوشش کرتی ہے۔ راشد فرد کو محض احساس یا اضطراب تک محدود نہیں رکھتے؛ وہ اسے تحریک دینے والا وجود بناتے ہیں۔ یہ اشعار نظم کو ایک روحانی استعلا (spiritual transcendence) تک لے جاتے ہیں، لیکن یہ استعلا روایتی معنوں میں زہد یا فنا نہیں بلکہ زندگی کی بازیافت، خودی کی فعّالیت، اور عمل کی صداقت پر مبنی ہے۔

"روشنی سے ڈرتے ہو؟
روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں
روشنی سے ڈرتے ہو؟"

ان اشعار میں راشد نظم کے ابتدائی سوال "زندگی سے ڈرتے ہو؟" کی فکری گونج کو نظم کے اختتام پر ایک نئی علامتی جہت کے ساتھ دہراتے ہیں۔ یہاں "روشنی" صرف بصری مظہر نہیں بلکہ ایک مکمل وجودی کیفیت ہے۔ وہ کیفیت جو خودی کی بیداری، شعور کی شدت، اور صداقت کے اعتراف سے وابستہ ہے۔ وجودی فلسفے میں "روشنی" ہمیشہ آگہی، آزادی اور حقیقت کے ادراک کی علامت رہی ہے۔ اسی بنا پر پلاٹو کے غار کے استعارے میں بھی روشنی وہ صداقت ہے جس سے انسان آنکھیں چراتا ہے۔ راشد یہاں اسی صداقت کو نظم کا نکتۂ اختتام اور عروج بناتے ہیں۔ "روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں" — اس

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

مصرع میں ایک گہری وجودی وحدت کا اعلان ہے۔ فرد، جو پہلے "تم" کے طور پر جدا تھا، اب "ہم" کے دائرے میں آ گیا ہے۔ یہ "ہم" کوئی اجتماعی نعرہ نہیں بلکہ بیدار شعوروں کا ربط ہے؛ وہ افراد جو سچائی کو پہچاننے کی جرات رکھتے ہیں۔ راشد کا یہ "ہم" وہ طبقہ ہے جو اظہار کرتا ہے، جو "ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں" کی مانند عمل پر یقین رکھتا ہے۔ اس استعارے میں "روشنی" خودی کا وہ پہلو ہے جس سے انسان خود ہی خائف ہے۔ وہ خود بھی روشنی ہے، لیکن وہ اپنی روشنی کی شدت، اس کی سچائی، اور اس کی اخلاقی ذمہ داری سے بچنا چاہتا ہے۔ یہ وہی صورتحال ہے جسے ژاں پال سارتر نے "Bad Faith" کہا — یعنی جب انسان خود کو اپنی سچائی سے محروم رکھتا ہے اور غیر حقیقی شناختوں میں پناہ لیتا ہے۔ راشد اس شعورِ گریز کو نظم کے سوالیہ لہجے میں بے نقاب کرتے ہیں۔ ادبی تنقید کے اعتبار سے یہاں "روشنی" بطور metaphysical metaphor سامنے آتی ہے — یعنی وہ علامت جو صرف مادی حقیقت کی نمائندہ نہیں بلکہ روحانی، اخلاقی، اور فکری بیداری کی مظہر بھی ہے۔ نظم قاری سے پوچھتی ہے: اگر تم خود بھی روشنی ہو، تو تم اس سے کیوں ڈرتے ہو؟ یہ سوال دراصل فرد کی خودساختہ نارسائی اور اپنی ذات سے اجنبیت کو نشانہ بناتا ہے۔

"شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا، پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی چاک ہو گیا آخر، خاک ہو گیا آخر
اژدہامِ انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی"...

نظم یہاں سے ماکرو سطح پر آ جاتی ہے۔ فرد کا باطن، جو پوری نظم میں سوالات اور علامتوں کے ذریعے تشکیل پا رہا تھا، اب اجتماعی منظرنامے میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ "شہر"، "فصیل"، "دیو"، "رات"، اور "لبادہ" — یہ سب وہ مظاہرِ جمود، جبر، اور خوف ہیں جو فرد کی روشنی کو دبائے ہوئے تھے۔ راشد نظم کے اختتام پر اعلان کرتے ہیں کہ اندھیرا شکست کھا چکا ہے۔ یہ وجودی فتح ہے — سچائی کی، بیداری کی، اور خودی کی۔

"فرد کی نوا آئی، ذات کی صدا آئی"

یہ مصرع نظم کا فکری اعلانِ اختتام ہے: انسان کی انفرادی آواز نے خود کو اجتماعی سطح پر ظاہر کر دیا ہے۔ اب وہ خاموش، خائف، اجنبی فرد نہیں رہا — بلکہ بیدار، شعوری، اور

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

تخلیقی فرد بن چکا ہے، جو نہ صرف خود کو پہچانتا ہے بلکہ دوسروں کو اظہارِ ذات کی طرف بلاتا ہے۔

"آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو"...

یہ آخری اشعار نظم کو ایک تعمیراتی امید (constructive hope) کے ساتھ مکمل کرتے ہیں۔ "آدمی چھلک اٹھے" — یہ اس کی اندرونی تکمیل ہے؛ "شہر پھر بسے" — یہ اس کی اجتماعی تشکیلِ نو ہے۔ ادب میں بہت کم نظموں کو یہ توفیق حاصل ہوتی ہے کہ وہ فرد کے اندر سے نکل کر کائناتی تبدیلی کے خواب تک پہنچیں — راشد کی یہ نظم وہ خواب پورا کرتی ہے۔

ن م راشد کی نظم "زندگی سے ڈرتے ہو" اردو نظم کی جدید روایت میں ایک ایسا فکری و شعری نمونہ ہے جو محض ادبی اظہار نہیں بلکہ ایک مکمل وجودی بیانیہ پیش کرتی ہے۔ یہ نظم سوالات، علامتوں، اور استعاروں کے ذریعے انسان کے اس باطن میں داخل ہوتی ہے جہاں زندگی، خوف، آزادی، خودی، بیداری، اور خاموشی جیسے بنیادی مسائل موجود ہیں۔ راشد نے اس نظم میں فرد کو ایک آئینہ دکھایا ہے — ایسا آئینہ جس میں وہ اپنی روشنی، اپنی کمزوری، اپنی زبان اور اپنے عمل کو پہچان سکتا ہے۔ نظم کے آغاز سے اختتام تک قاری ایک فکری سفر میں شریک ہوتا ہے جس کا آغاز سوال سے ہوتا ہے، راستے میں احتجاج، مزاحمت، انکار اور بیداری سے گزرتا ہے، اور آخرکار تحریک، اظہار اور اجتماعی نجات پر منتج ہوتا ہے۔ نظم کا پہلا سوال — "زندگی سے ڈرتے ہو؟" — صرف ایک استفہامیہ جملہ نہیں بلکہ فرد کے وجود پر ضرب ہے۔ یہ سوال اس کی لاشعوری سطح پر موجود انکار، جمود اور خوف کو سطحِ شعور پر لاتا ہے۔ اس کے بعد نظم بتدریج فرد کو اُس کے اظہار کی صلاحیت ("زبان")، اس کی معنویت ("معنی")، اور اس کی قوتِ عمل ("ہاتھ") سے آشنا کراتی ہے۔ "روشنی"، "ان کہی"، "اذان"، "راہ"، اور "فصیل" جیسی شعری علامتیں نظم کو محض تجرباتی یا جذباتی بیان سے نکال کر فکری استعارہ سازی کی سطح پر لے جاتی ہیں، جہاں ہر لفظ ایک جہت، ہر پیکر ایک دروازہ، اور ہر مصرع ایک داخلی مکاشفہ بن جاتا ہے۔ نظم میں زبان صرف بیان کا وسیلہ نہیں بلکہ ایک ادراکی طاقت بن کر سامنے آتی ہے، جو شعور اور حقیقت کے درمیان ربط قائم کرتی ہے۔ وجودی فکر کے زاویے سے دیکھیں تو یہ نظم فرد کی وجودی خودی (authentic self)، اس کی آزادی کا بوجھ (burden of choice)، اس کی خوفِ آگہی

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

(fear of awareness)، اور اس کی فکری نجات کو شاعرانہ پیرائے میں پیش کرتی ہے۔ راشد کا فرد "انکار" سے "اظہار"، "خاموشی" سے "آواز"، اور "خوف" سے "روشنی" کی طرف ایک مکمل سفر طے کرتا ہے۔ یہ وہی سفر ہے جسے وجودی مفکرین نے فرد کی داخلی بازیافت (existential recovery) کہا ہے۔ نظم کا اسلوب، ساخت، علامتی نظام، اور فکری وسعت اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ن م راشد نے اردو نظم کو محض اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں بلکہ شعوری دریافت، فکری مکالمہ، اور روحانی بیداری کا ایک مکمل وسیلہ بنا دیا۔ "زندگی سے ڈرتے ہو" ایک ایسی نظم ہے جو قاری کو صرف متاثر نہیں کرتی بلکہ اسے بدلنے کی تحریک بھی دیتی ہے — اس کی ذات کے اندر، اس کی سوچ میں، اور اس کی ذمہ داری کے احساس میں۔ آخر کار، یہ نظم اردو ادب میں نہ صرف ایک فکری تبدیلی کی علامت ہے، بلکہ وہ جمالیاتی تجربہ بھی ہے جس میں سوالات، خوف، روشنی، بیداری، اور خودی، ایک مربوط شعری کائنات میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ ن م راشد کا یہ فکری و جمالیاتی کارنامہ اس نظم کو اردو نظم کی جدید روایت میں ایک مکمل وجودی درسگاہ بنا دیتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی:

(1) آغا، ڈاکٹر وزیر (2000ء)، "نظم جدید کی کروٹیں"، نئی دہلی، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص 11۔

(2) مظہری، کوثر (2008ء)، "جدید نظم: حالی سے میرا جی تک"، نئی دہلی، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص 11۔

(3) کیر کیگارڈ، ایس (1980ء)، " The Concept of Anxiety"، پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ص 304۔

(4) نطشے، فریڈرک (2006ء) " Thus Spoke Zarathustra "، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص 312۔

(5) فلن، ٹی آر) 2006، " Existentialism: A Very Short Introduction"، (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص 112۔

(6) کریم، ارتضیٰ (2004ء)، "اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے"، دہلی، اردو اکادمی، ص 11۔

(7) راشد، ن م (2011ء)، "کلیات راشد"، دہلی، کتابی دنیا، 203۔

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 01 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347